بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذشتہ ماہ شامِ ہمدرد کے زیرِ اہتمام ایک علمی تقریب میں ملک کے ایک نامور جج کی زیرِ صدارت سابق قاضی القضاۃ مغربی پاکستان نے " قرآن کا تصوّرِ ریاست " کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا۔ یہ مقالہ اعلیٰ طباعتی معیار کے ساتھ شائع ہوا ہے اور اسے بعض روایات کے مطابق انتہائی سرگرمی کے ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت پھیلایا جا رہا ہے۔ صاحب مقالہ نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ہمیں یہ مژدۂ جانفزا بھی سنایا ہے کہ شامِ ہمدرد کی محفلیں سجانے والے حکیم محمد سعید صاحب اس طرح کے دیگر عنوانات کے تحت ذی علم حضرات کو مقالات پیش کرنے کی دعوت دے رہے ہیں جن میں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے کہ جو بات بھی کی جائے وہ "خالص قرآنی نقطۂ نظر" سے کی جائے۔

ہم اس فاضلانہ مقالے کے مندرجات پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلم قوم کے اندر یہ رجحان ہی بڑا خطرناک ہے کہ اس کے اہلِ علم سنت سے بے نیاز ہو کر صرف قرآن کی روشنی میں اپنے مسائل حل کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی یہ روشنی جس مقدس ذریعے سے ان تک پہنچی ہے اسی مقدس ذریعے سے ملّت کو وہ روشنی بھی ملی ہے جسے سنّتِ رسولؐ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جس کی مدد سے ایک انسان قرآن کی روشنی سے صحیح طور پر فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ قرآن کی روشنی بلاشبہ ایک نہایت ہی پاکیزہ آسمانی روشنی ہے لیکن اس پاکیزہ روشنی کو زمین پر لانے اور پھر اس روشنی کی مدد سے خدا کے منشا کے مطابق دنیوی اور اخروی مسائل کو صحیح طور پر حل کرنے میں ہمیں سنّتِ رسولؐ ہی سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر تنہا یہ "آسمانی روشنی" ہی کافی ہوتی، تو اس نور کے پھیلانے اور اس سے کماحقہ فائدہ اُٹھانے کے لیے کسی پیغمبر کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا چھاپہ خانہ درکار تھا جس کے ذریعے یہ "کتابِ ہدایت" ہر قسم کے "اغلاط سے پاک" پوری دنیا میں پھیلا دی جاتی اور دنیا

کے اصحابِ علم و دانش اور ماہرینِ قانون اس سے اپنی بساط کے مطابق احکام اخذ کرتے۔ سنّت سے بے نیاز قرآن کے "شیدائیوں" کے جس قدر" اجتہادات" بھی ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے امّت نے گمراہی سمجھ کر مسترد نہ کر دیا ہو۔ جسٹس فذیرالدین صاحب نے اپنے مقالے میں دو مسلم مفکرین کی دینی بصیرت اور ان کے "اجتہادی کارناموں" کو امّت کے لیے مشعل راہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے انہیں زبردست دادِ تحسین دی ہے۔ ان میں سے ایک مفکر جناب جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان ہیں۔ جنہوں نے اپنی کتاب "اسلام میں ارتداد کی سزا" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دینِ حق کے اندر مرتد کو قتل کرنے کی جو سزا رکھی گئی ہے وہ صحیح نہیں۔ دوسرے مفکر سید یعقوب شاہ صاحب ہیں جنہوں نے اپنی تصنیف "چند معاشی مسائل اور اسلام" میں کاروباری ضرورتوں کے لیے قرضوں اور بنکوں میں جمع کردہ رقوم پر سود کو حلال و طیّب ثابت کرنے پر پورا زور صرف کیا ہے۔ جو مفکر "اجتہادات" کے ان نوادر کو اپنے سامنے بطور نمونہ رکھ کر قرآن کی روشنی میں اسلام کے تصور ریاست کی وضاحت کرنے کی کوشش کرے اس کی توضیحات اگر پریشان فکری اور پریشان نظری کا شاہکار نہیں تو اور کیا ہوں گی۔

جسٹس صاحب کا طرزِ استدلال بالکل وہی ہے جو عام طور پر غیر مسلم مستشرقین اور مسلمان مستغربین اختیار کرتے ہیں کہ پہلے وقت کے تقاضوں کے بارے میں یہ خیال ذہنوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی جائے کہ یہ فطرت کے ایسے اٹل ضابطے ہیں جن کے اندر کوئی تغیر ممکن نہیں اور انسان انہیں جوں کا توں قبول کرنے پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح وہ قوانین قدرت کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ پھر جب مسلمان ان کی یہ بات اچھی طرح گرہ میں باندھ لیں اور نہ صرف حالات کے تقاضوں کی بالادستی بلکہ ان کی قطعی حیثیت کو بھی تسلیم کر لیں تو اس کے بعد انہیں یہ بات سمجھائی جائے کہ اگر عصری تقاضوں میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی تو اُن سے الگ رہنا یا اُن سے ٹکرا کر سر پھوڑنا کہاں کی دانائی اور خدمت ملی ہے۔ کیا ہوشمندی کا تقاضا یہ نہیں کہ احکامِ شریعت میں ایسی تبدیلیاں پیدا کی جائیں جن سے عصری تقاضوں کے ساتھ سازگاری پیدا ہو سکے؟

فاضل مقالہ نگار جس منطق کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ بڑی دلچسپ ہے۔ ان کے نزدیک کسی چیز کا عملاً وجود ہی اس کے صحیح اور برحق ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ارشاد یہ ہے کہ چونکہ موجودہ دور کی چالیس مسلم ریاستوں میں سے کسی ایک کو بھی صحیح معنوں میں اسلامی ریاست نہیں کہا جا سکتا اس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ان مسلمان مملکتوں کے سربراہ اسے نافذ کرنے سے آخر کیوں گریز کرتے؟ یہ لوگ کافر تو نہیں، مسلمان ہی ہیں۔ ان میں اچھی خاصی تعداد نہایت ذہین افراد پر مشتمل ہے۔ اس حقیقت کا ذکر کرنے کے بعد مقالہ نگار ان کے اس اسلام گریز طرزِ عمل کی یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں۔

"یہ لوگ عملی انسان ہیں جنہیں مسائل کا سامنا کر کے ان کے حل تلاش کرنا ہیں۔ وہ اپنے موجودہ طرزِ عمل کو اس وقت تک ترک نہیں کر سکتے جب تک کہ انہیں اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ اگر وہ (اسلام) کے تابع فرمان بن جائیں تو اجتماعی معاملات بخوبی طے ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر ہم ان حضرات کو قائل یا ان کے اندازِ فکر کو تبدیل کرنے سے قاصر ہیں تو ان کمزور افراد کی تائید وحمایت کا کیا فائدہ جو نہ تو معاملات کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں اور نہ قوم کی سربراہی کا منصب سنبھال سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ لوگ ہماری قیمتی عددی قوت تو ہیں مگر یہ اہم مسائل کو منفی انداز میں حل کرنے کے عادی ہیں، اور ہمیں تعمیری اندازِ فکر کی ضرورت ہے۔ یعنی اختصاصی علم اور دنیوی معاملات کا تجربہ ص ۳۶۔"

ہم یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ گذشتہ سالوں میں نہ صرف ہمارا اخلاق بگڑا ہے بلکہ سوچنے سمجھنے کا معیار بھی کافی حد تک پست ہوا ہے۔ ملک کے ایک نامور صاحب علم لادینیت کے حق میں اس طرح کی بھونڈی دلیلیں پیش کر کے اپنے موقف کی صحت تسلیم کروانے پر مصر نظر آتے ہیں۔ اگر ہم فاضل مقالہ نگار کی یہ بات تسلیم کر لیں کہ کسی چیز کا موجود ہونا ہی اس کے برحق ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور کسی چیز کی غیر موجودگی اس کے ناممکن العمل ہونے کی زبردست شہادت تو اس سے تو دنیا میں خیر اور بھلائی کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے ہم جسٹس صاحب کی خدمت میں بصد احترام عرض کرتے ہیں کہ دنیا میں عدل و انصاف کا جو نظام قائم ہے کیا اس کی بساط اس لیے لپیٹ دی جائے کہ یہاں مثالی انصاف عنقا ہے؟ کیا جمہوریت اور جمہوری اداروں کو اس لیے دفن کر دیا جائے کہ آج تک دنیا میں مثالی جمہوریت کبھی قائم نہیں ہوئی؟ کیا ظلم و استبداد کے خلاف اس وجہ سے جدوجہد ترک کر دی جائے کہ پوری دنیا میں صلح و آشتی کی مکمل عملداری کا کوئی نشان نہیں ملتا؟ بلند مقاصد اور ارفع نصب العین تو ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ ایک طرف تو لوگوں کی صحیح سمت پر راہنمائی کریں اور دوسری طرف ان کے اندر ان کے حصول کی

آرزو اور تڑپ پیدا کر کے انہیں تعمیری راہ پر گامزن رکھیں۔

اگر جناب قدیر الدین صاحب کی منطق کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اسلامی ریاست کے قیام کے مقدس نصب العین کو محض اس بنا پر چھوڑ دیا جائے کہ دنیا کی چالیس مسلم ریاستوں میں سے کوئی ایک ریاست بھی اسلامی نظام کا صحیح نقشہ پیش نہیں کرتی تو پھر ہمیں اس منطق کی رُو سے صرف اس ایک مقصد سے ہی دست بردار نہ ہونا پڑے گا بلکہ زندگی کی ساری ارفع و اعلیٰ اقدار کو بھی تیاگ دینا ہوگا، کیونکہ انسانوں کی عظیم اکثریت اُن سے عاری ہے۔ اگر کسی چیز کا وجود ہی اس کے صحیح ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے تو پھر کفر و الحاد، ظلم و استبداد، ناانصافی اور زیردست آزاری، اخلاقی بے راہ روی اور مکر و فریب جیسے معائب کے خلاف صف آرا ہونے کے بجائے انہیں صحیح اور برحق سمجھ کر سینے سے لگانا چاہیے۔ کیونکہ آج کی دنیا میں انہیں غلبہ حاصل ہے اور ان مذموم صفات کے مقابلے میں جتنی اعلیٰ صفات کا تصوّر کیا جاسکتا ہے انہیں باطل سمجھ کر اپنے دل و دماغ سے محو کر دینا چاہیے کیونکہ ان سے متصف ہونے والے افراد انسانی معاشرے میں کسی نمایاں حیثیت کے حامل نہیں اور ان کی تعداد بھی نہایت ہی قلیل ہے۔

پھر فاضل مقالہ نگار کے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہیے کہ اسلامی ریاست کے قیام کا نصب العین کوئی ایسا نصب العین نہیں جس پر کسی طرح سے "پیکر خیال" ہونے کا اطلاق ہوسکتا ہو۔ یہ ایک ایسا ممکن الحصول نصب العین ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں باقاعدہ حاصل کر کے پوری دُنیا کو اس کا عملی نمونہ دکھایا گیا اور جس کی پوری تفصیلات کا مستند ریکارڈ آج تک موجود ہے۔ پھر حضورؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ربع صدی تک یہ نظام اپنی فطری آب و تاب کے ساتھ یہاں موجود رہا۔ اور اس کے بعد بھی متعدد ادوار ایسے آئے جن میں یہ نظام باقاعدہ قائم ہوا اور بڑی کامیابی کے ساتھ نہ صرف امور مملکت بلکہ سارے اجتماعی مسائل بھی اسی کے مطابق حل کیے جاتے رہے۔ اگر اس نظام کی مدت عملداری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بلا مبالغہ صدیوں پر محیط ہے۔ اس نظام کے مقابلے میں دنیا کا کوئی ایک نظام بھی ایسا نہیں جس کے علمبردار اس بات کا دعویٰ کر سکیں کہ ان کا دلپسند نظام اپنی مثالی صورت میں دنیا کے کسی خطہ میں ایک ثانیہ کے لیے بھی قائم ہوا ہے۔ کیا جمہوریت کے داعی مثالی جمہوریت کی کوئی ایک مثال پیش کر سکتے ہیں یا اشتراکی ممالک میں سے کسی ایک ملک کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اشتراکی نظام اپنی مثالی شکل میں

وہاں قائم ہے۔ ریاست اور طبقات کا وجود اشتراکیت کی عین ضد ہے لیکن سارے اشتراکی ممالک میں ریاست کی ظالمانہ جکڑ بندیاں بھی ہیں اور طبقات کی قہرمانیاں بھی اور یہ دونوں اشتراکیت دشمن ادارے تحلیل ہونے کے بجائے دن بدن قوت وطاقت حاصل کرتے جارہے ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی اشتراکی یہ بات تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتا کہ ریاست اور طبقات کے بغیر انسانیت کی اجتماعی شیرازہ بندی کا تصور محض کسی دیوانے کا خواب ہے۔ اس نوعیت کی جسارت ایک "مسلمان دانشور" ہی کرسکتا ہے کہ وہ اہل علم کے ایک بڑے اجتماع میں ایک ایسے نظامِ حیات کو ناممکن العمل قرار دے کر مسترد کرنے کی دعوت دے یا اس طرح کی حماقت کرنے والوں کی تائید کرے جس کی حیات آفرین شعاعوں نے اس خطۂ ارضی کے ایک بہت بڑے حصے کو صدیوں تک منور رکھا۔

واجب الاحترام مقالہ نگار کو یہ فکر بڑی شدت سے لاحق ہے کہ جب مسلم قوم کے "دانشور" جو حکمرانی کے منصب پر بھی فائز ہیں، اسلام کو نافذ کرنے سے گریز کر رہے ہیں تو اس نظام کے اندر ضرور کوئی ایسی خرابی موجود ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اس کے خلاف یہ معاندانہ طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اگر انہیں اس بات پر شرح صدر حاصل ہو جائے کہ اس نظام کے قیام سے مسلم قوم کے اجتماعی مسائل بطریق احسن حل ہوتے چلے جائیں گے تو انہیں اس کے قیام کی راہ میں مزاحم ہونے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ہم جسٹس صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں "دشواریوں کا تذکرہ" تو بعد کی باتیں ہیں ایسے "دانشوروں" کو جنہیں اس بات پر شرحِ صدر حاصل نہیں کہ اگر کافرانہ نظام کو ہٹا کر اسلامی نظام قائم کر دیا جائے تو امتِ مسلمہ کے اجتماعی مسائل بخوبی حل ہوسکیں گے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے کیونکہ ایمان تو نام ہی اس یقین کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے انسانیت کو جو ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہی انسانی مسائل کا صحیح حل اور انسانیت کے دکھوں کا حقیقی مداوا ہے۔ جن "دانشوروں" کو اس حقیقت ہی میں شک ہے انہیں اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی اور تعلقِ خاطر پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں ایک مومن کی سب سے بڑی نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جب بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کا کوئی حکم سنتا ہے تو اس کے سامنے فوراً سرِ تسلیم خم کر لیتا ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ	ایمان لانے والوں کا تو کام ہی یہ ہے کہ جب
اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف بُلائے جائیں تاکہ
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا	رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں
سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۔	کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی ۔

(النور - ۵۱)

اسی حقیقت کو نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے ۔

ذاق طعم الایمان من	اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھا جو اللہ کے رب ہونے
رضی باللہ ربا وبالاسلام	پر اور اسلام کے ضابطہ حیات ہونے پر اور محمد صلی اللہ
دینا وبمحمد رسولا ۔	علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہوا ۔

جن لوگوں کو ابھی اس بات پر شرح صدر حاصل نہیں ہوا کہ اسلام ہی خدا کا واحد پسندیدہ دین ہے انہیں اپنے اس " تشکک " کا دِقّتِ نظر سے جائزہ لے کر یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دینی اعتبار سے کس مقام پر کھڑے ہیں ۔

" دانشوروں " کے اس موقف کے بارے میں خود مقالہ نگار کو بھی سوچنا چاہیے کہ اس میں کتنے منطقی مغالطے پائے جاتے ہیں ۔ انہوں نے یہ کیونکر فرض کر لیا ہے کہ غلطی یا خامی جو کچھ ہے وہ اسلام میں ہے اور اس بنا پر یہ " پرستارانِ دانش " دینِ حق سے بدظن ہیں ۔ کیا اس بات کا قوی امکان نہیں کہ مغرب کے یہ شیدائی اسلامی نظامِ حیات کے قیام سے اس لیے گریزاں ہیں کہ ان کے بگڑے ہوئے مزاج ان اخلاقی پابندیوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتے جو اس نظام کے قیام کے بعد ان پر لازمی طور پر عائد ہوں گی یا وہ اپنی زندگیوں میں وہ تبدیلیاں لانے سے قاصر ہیں جن کا اسلام تقاضا کرتا ہے ۔ اگر کوئی شخص کسی نظریہ یا نظام کو مسترد کرتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہوتی کہ اس نظریے اور نظام میں بعض اسقام پائے جاتے ہیں ۔ بسا اوقات انسان کے اندر کا شیطان بھی اسے قبول کرنے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے ۔ جو لوگ حق وصداقت کا راستہ چھوڑ کر باطل کی راہ اختیار کرتے ہیں وہ اس بناء پر ایسا نہیں کرتے کہ حق وصداقت میں انہیں بعض خامیاں نظر آتی ہیں ، بلکہ وہ اس راہ پر اس بنا پر گامزن نہیں ہوسکتے کہ اس راستہ پر چل کر انہیں نفس کی بعض ترغیبات سے دامن کش رہنا اور اس راہ کی بعض دشواریاں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، جس کے لیے وہ اپنے اندر ہمت نہیں پاتے ۔

لیکن ان میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی اس کمزوری کا برملا اعتراف کرلیں۔ یہ اعتراف بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اس سے وہ اپنے اندر ایک قسم کی خفت محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی ان کمزوریوں کو چھپانے اور اپنی جھوٹی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں پر جوں کا توں قائم رکھنے کے لیے حق وصداقت کے اندر خامیوں کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کرانے لگتے ہیں کہ جس راستہ کو وہ حق وصداقت کی راہ خیال کر رہے ہیں وہ تو سرے سے سلامتی کا راستہ ہے ہی نہیں بلکہ یہ راستہ انہیں ایک غلط سمت کی طرف لے جائے گا جس پر چل کر وہ خوفناک تباہی سے دوچار ہوں گے۔ اگر یہ راستہ فی الحقیقت سلامتی کا راستہ ہوتا تو اہل دانش اس راہ پر گامزن ہونے سے کیوں گریز کرتے۔ ان کی اس الٹی منطق کا صاف مطلب یہ ہے کہ حق وصداقت کا اصل معیار وہ نہیں جو ہمیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیا ہے بلکہ ان دانشوروں کی پسند اور ناپسند ہے۔ وہ جس چیز کو صحیح قرار دے دیں وہی فی الحقیقت صحیح اور برحق ہے اور جس کے بارے میں ان کی زبان سے باطل کا فتویٰ صادر ہو جائے وہ لازمی طور پر گمراہی ہی ہے۔ جسٹس صاحب کی یہ نکتہ آفرینی ملاحظہ ہو۔

> "(مسلمانوں) کے لیے اب دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دنیائے (اسلام) میں جو لوگ بھی مسند اقتدار پر فائز ہیں انہیں مع مسلم دانشوروں کے ناقابلِ اصلاح سمجھ کر یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ کیا ہمارے مطالبات کو عملی طور پر پورا بھی کیا جا سکتا ہے اور اگر انہیں فی الحقیقت دنیائے عمل میں پورا کیا جا سکتا ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ سوچنے سمجھنے والے مسلمان جو (دنیوی) معاملات کا فہم بھی رکھتے ہیں وہ ان مطالبات (کے تسلیم کرنے) میں (مزاحم ہوتے ہیں۔ وہ آخر ایسے ناسمجھ تو نہیں کہ مسلم قوم کی عظیم اکثریت کو مطمئن رکھنے کی قدر وقیمت کو نہ جانتے ہوں"۔ ۳۷

جسٹس صاحب اس اندوہناک صورتِ حال پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آج دنیائے اسلام میں اگر دینی نظام سے گریز کی راہ اختیار کی جا رہی ہے تو اس کی کسی طرح بھی ذمہ داری ان "معاملہ فہم" اور باعمل افراد پر عائد نہیں ہوتی جنہیں مغربی استعمار ان بدنصیب ممالک میں اپنا جانشین بنا کر مسند اقتدار پر متمکن چھوڑ گیا ہے۔ بلکہ ان رجعت پسند مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ احکامِ الٰہی میں کوئی تغیر وتبدل

(باقی بر صفحہ ۲۵)

(بقیہ اشارات)
نہیں کیا جا سکتا اور ان کے ساتھ ساتھ وہ اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ یہ احکامِ الٰہی انسان کی پوری زندگی داخلی اور خارجی — پر محیط ہیں۔ رجعت پسند مسلمانوں کے اس غلط تصور پر چوٹ کرنے کے بعد فاضل مقالہ نگار فوراً شریعت کے ماخذ بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس سلسلے میں قرآن حکیم، سنّت رسولؐ، قیاس اور اجماع کی صراحت کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ اگر قانون کے ان چار سرچشموں کو شریعت اسلامی کے ماخذ تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس نظام کا تین چوتھائی حصہ خالص انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں قرآن حکیم کے علاوہ اسلامی شریعت کا کوئی ماخذ بھی ایسا نہیں جسے انسانی ذہن کی اختراع نہ کہا جا سکے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جسٹس صاحب حدیث نبویؐ اور سنّتِ رسولؐ کو بھی معاذ اللہ حضورؐ کی اپنی ذہنی اپج قرار دے رہے ہیں اور اسے بھی اسی مقام پر تصور کرتے ہیں جس مقام پر کہ دوسرے علماء کے اجتہادات ہیں۔ سنّتِ رسولؐ کے بارے میں اس سے زیادہ ناسمجھی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ حضورؐ کے دیے ہوئے احکام کے متعلق تو خود اللہ تعالیٰ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اسی کے احکام ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى - اِنْ	اور وہ اپنی خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کرتے۔
هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى	وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ تو وہ صرف وحی ہے جو ان پر نازل
(سورۃ النجم - ۳-۴)	کی جاتی ہے۔

ایک دوسرے مقام پر اسی بات کی اس طرح صراحت کی گئی ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ	اور (اے نبیؐ) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ -	نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو جو
(سورۃ النحل - ۴۴)	ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس آیت کا صاف مطلب ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الذکر" کی تبیین کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا وہ شریعت اسلامی کا اتنا ہی لازمی حصہ ہے جتنا کہ قرآن مجید۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے بال گوندھنے اور گوندھانے والیوں پر اور دانتوں کو کشادہ کرنے والیوں پر (تاکہ وہ کم سن معلوم ہوں)، جب یہ بات بنی اسد کی ایک خاتون (جس کا نام ام یعقوب تھا اور جو قرآن مجید کی بہت زیادہ تلاوت کیا کرتی تھی) تک پہنچی تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں نے سُنا ہے کہ تم اس طرح

کے کام کرنے والی عورتوں پر لعنت کرتے ہو تو آپ نے فرمایا: میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں جس پر کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے اور یہ بات تو کتاب اللہ میں موجود ہے۔ اس پر وہ عورت کہنے لگی: میں نے تو پورا قرآن پڑھا ہے مگر یہ حکم میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔ اس پر عبد اللہ بن مسعودؓ نے ارشاد فرمایا:

لئن کنتِ قرأتیه لقد وجدتیه قال الله عز وجل وما اٰتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنه فانتھوا۔	اگر آپ غور سے اس کا مطالعہ کرتیں تو اس حکم کو کتاب الٰہی میں ضرور پالیتیں (کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا) رسولؐ جو بات بھی تمہیں بتلائیں اسے مان کر اس پر عمل کرو اور جس بات سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

(صحیح مسلم ۔ کتاب اللباس والزینۃ)

صحابہ کرامؓ سنت کی ترویج و اشاعت کو دین کے لیے کس قدر ضروری سمجھتے تھے اس کا اندازہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس خطبے سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت ارشاد فرمایا:

"الٰہی! میں تجھے ان لوگوں پر گواہ بناتا ہوں جنہیں میں نے شہروں کے نظم و نسق پر مامور کیا ہے۔ میں نے انہیں اس لیے بھیجا ہے کہ وہ انصاف کریں اور لوگوں کو دین کی باتیں بتلائیں اور اپنے نبی کی سنت سکھائیں۔"

(صحیح مسلم ۔ کتاب الصلوٰۃ)

ہم نے یہ چند آیات اور صحابہ کرامؓ کے دو اقوال اس لیے پیش کیے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ جسٹس صاحب سنت رسولؐ کے بارے میں جو موقف اختیار کر کے اپنے استدلال کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ کتنا غلط ہے۔ حضورؐ کے ارشادات و فرمودات تو حضورؐ کے اپنے عہد سے لے کر آج تک مسلمانوں کے اندر اسی طرح مقدس، واجب التنظیم اور واجب الاطاعت تسلیم کیے جا رہے ہیں جس طرح کہ قرآن مجید کے احکام۔ یہ انکشاف دور جدید کے چند مجتہدین کو ہی ہوا ہے کہ سنتِ رسولؐ کی صورت میں ہمارے پاس دین کا جو بیش قیمت سرمایہ موجود ہے وہ انسانی عقل کی پیداوار ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ فاضل مقالہ نگار "جس مجتہد" کو اپنے اس موقف کی تائید میں بطور گواہ پیش کر رہے ہیں سنّت کے بارے میں اس کا موقف فاضل مقالہ نگار سے یکسر مختلف ہے۔ اس شخص نے سنّت کی آئینی حیثیت کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے ISLAM AT THE CROSS ROADS

کے آخری باب میں اس نے اسلام کے اندر سنّت کی اہمیت پر بڑی فکر انگیز بحث کی ہے ۔ اس کے علاوہ "عرفات" کے متعدد شماروں میں اسلامی نظام کے قیام کے ضمن میں اس نے نہایت واضح طور پر یہ بتایا ہے کہ اسلامی شریعت کے دو ماخذ الہامی ہونے کی وجہ سے دستور اسلامی کی ایسی ٹھوس بنیادیں فراہم کرتے ہیں جو ناقابلِ تغیّر ہیں ۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ فاضل مصنّف نے اس مفکر کا جو اقتباس اپنی حمایت میں نقل کیا ہے وہ سنت کے بارے میں اُن کے پیش کردہ موقف کی نہایت واضح الفاظ میں تردید کر رہا ہے ۔

وہ اقتباس ملاحظہ ہو:

" یہ بات اچھی طرح متعارف ہے کہ فقہ اسلامی کے سارے قوانین ان واضح نصوص پر مبنی نہیں جنہیں قرآن وسنت میں اوامر و نواہی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے فقہی احکام کا بہت بڑا حصہ استخراجی طرزِ استدلال جس میں قیاس کو اچھی خاصی اہمیّت حاصل ہے، کا نتیجہ ہے ۔ ماضی کے بلند پایہ فقہا نے قرآن وسنّت سے ہی احکام مستنبط کیے اور فقہ کی تدوین جن حضرات نے کی ان کا نہ صرف قرآن وسنّت کا مطالعہ نہایت گہرا تھا بلکہ انہوں نے اس کام میں بڑی جانفشانی کا ثبوت دیا ۔"

(اسلام میں ریاست اور حکومت کے اصول ص۱۱ از محمد اسد لیوپولڈ)

بے جا نہ ہوگا اگر ہم اس مصنّف کا ایک اور اقتباس جس سے سنت کے بارے میں اس کا موقف کھل کر سامنے آتا ہے پیش کریں ۔

اسلامی طرزِ زندگی ۔ ذاتی ہو یا اجتماعی، کے بنیادی اصول شریعت کے اندر موجود ہیں ۔ دینی اصطلاح کے مطابق شریعت کے معنی ہیں وہ سیدھا راستہ جسے احکامِ الٰہی اور احکامِ رسولؐ نے متعین کیا ہے یعنی قوانینِ اسلامی ۔ شارح سے اوّلاً مراد خداوند قدوس ہے اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے ۔ خداوند تعالیٰ نے ان پر وہ کتاب نازل فرمائی جو قوانین کا سرچشمہ ہے دوسرے حامل وحی ہونے کی حیثیت سے اُن کی ذات گرامی ہی اس بات کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات پر مامور تھی کہ وہ قرآنی احکام کی تبیین کا کام سرانجام دیں اور ہمیں بتائیں کہ انہیں عملی زندگی میں کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ

نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ

اے پیغمبرؐ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تمہیں اپنی محبت سے نوازے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اللہ گناہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

ان احکام کی تبیین کے علاوہ جن کا ذکر قرآن مجید میں صاف طور پر موجود ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر یہ فرض بھی عائد کیا گیا کہ وہ ان احکام کے ساتھ اوامر اور نواہی کی صورت میں دوسرے احکام شامل کر کے نظام شریعت کو مکمل کریں، ایک مسلمان کے لیے ان اوامر اور نواہی کی پابندی بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ ان ضابطوں کی جو ہمیں قرآن مجید سے حاصل ہوئے ہیں۔

(مجلہ عرفات انگریزی نومبر ۱۹۴۶ء)

(باقی)